رسائل و مسائل

ایمان اور عمل کا تعلق

سوال: ائمۂ سلف میں اس مسئلے کے بارے میں بہت اختلاف رہا ہے کہ عمل صالح ایمان کا جزء ہے یا نہیں۔ میں نے قرآن و حدیث و سیرت کا بھی مطالعہ کیا ہے، اپنی حد تک ائمہ کے اقوال و استدلال کو بھی دیکھا ہے اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے بھی رجوع کیا ہے۔ لیکن اس سوال کا شافی جواب حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض لوگوں نے محض اختلافات کو ہوا دینے کے لیے اس مسئلے کو چھیڑا ہے، لیکن میرا مقصد سوائے تحقیق و اطمینان کے کچھ نہیں ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ اس کا جواب بذریعہ ترجمان دیں۔

جواب: اعمال کے جزوِ ایمان ہونے یا نہ ہونے کی بحث کو خواہ مخواہ ابھار دیا گیا ہے، ورنہ بات بجائے خود صاف ہے۔ اس میں ایک جہت وہ ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے اختیار کی ہے اور وہ بجائے خود حق ہے، مگر اعتراض کرنے والوں نے اُس جہت کو نظر انداز کر کے دوسری جہت سے اس پر اعتراض کر دیا۔ اسی طرح اس مسئلے کی ایک دوسری جہت وہ ہے جو امام بخاری وغیرہم نے اختیار کی اور وہ بھی برحق ہے، مگر رد کرنے والوں نے ایک مختلف جہت سے اس کو رد کرنا شروع کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اپنی اصل کے اعتبار سے شہادتِ قلب اور تصدیقِ ذہنی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عمل اس لفظ کے مفہوم میں بداہتہً شامل نہیں ہے۔ آپ خود سوچیے کہ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ "میں نے فلاں بات مان لی"، یا میں اس کا "قائل ہو گیا"، یا "میں اس کی صداقت پر گواہ ہوں"، تو سننے والا ان الفاظ سے کیا سمجھتا ہے؟ کیا محض عقیدہ و خیال کا اظہار؟ یا اس کے ساتھ کوئی عمل بھی؟ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ صرف عقیدہ و خیال کے اظہار کے لیے بولے جاتے ہیں، اور سننے والا یہ الفاظ سن کر بس اتنا ہی سمجھتا ہے

کہ آدمی کے خیالات میں تبدیلی آگئی ہے۔ ایمان کی یہی حقیقت قرآن و حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کی تفسیر خود یوں فرماتا ہے کہ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ اس تفسیر کی رو سے ایمان کی کوئی حقیقت مان لینے اور قائل ہو جانے کے سوا نہیں ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیلؑ کے سوال فاخبرنی عن الایمان کے جواب میں فرماتے ہیں اَنْ تؤمنَ باللہِ وملائکتہٖ وکتبہٖ ورُسُلہٖ والیوم الآخر وتؤمنَ بالقدرِ خیرہٖ وشرِّہٖ۔ یہ تفسیر نبوی بھی ایمان کے معنی "مان لینے" ہی کے بتا رہی ہے نہ کہ اس کے ساتھ کچھ کرنے کے بھی۔ اسی بنا پر یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص کلمۂ اسلام کا قائل ہو جانے کے بعد اچانک کسی حادثے کا شکار ہو جائے، قبل اس کے کہ وہ نماز پڑھے یا روزہ رکھے یا کوئی عمل اسلام پر کر سکے، تو وہ مومن مریگا نہ کہ کافر۔

یہ اس مسئلے کی ایک جہت ہے، اور اس کے برحق ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اب دوسری جہت لیجیے۔ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ میں فلاں بات کو مان گیا، تو آپ فطرۃً یہ توقع کرتے ہیں کہ اب اس کے عمل اور برتاؤ میں اس مان لینے کے آثار و نتائج ظاہر ہونگے۔ ہر شخص کی عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک بات کو مان لینے کے جو لازمی آثار و نتائج ہیں وہ مان لینے والے کے عمل اور برتاؤ میں ظاہر ہوں۔ حتیٰ کہ اگر وہ ظاہر نہ ہوں، یا ایسے آثار ظاہر ہوں جو عقلاً نہ ماننے ہی کے آثار ہو سکتے ہوں، تو ہر دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ اس شخص نے درحقیقت وہ بات نہیں مانی ہے جس کے ماننے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں ماننے اور منوانے کا سارا کام جو کیا جاتا ہے اس سے مقصود محض مان لینا اور منوا لینا ہی نہیں ہوتا بلکہ منوانے والا اسی لیے کچھ باتیں منواتا ہے کہ اس کے بعد ماننے والا اس ماننے کے عملی تقاضے پورے کرے، اور ماننے والا جب ماننے کا اقرار و اعلان کرتا ہے تو ہر صاحب عقل اس کا مطلب یہی لیتا ہے کہ وہ اب اس ماننے کے تقاضے پورے کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی شخص کو شراب کی برائی کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ عملاً شراب نوشی سے اجتناب کرے، نہ اس لیے کہ وہ بس شراب کی برائی

کا قائل ہو جائے۔ اور جب وہ اس کا اقرار کرتا ہے کہ واقعی شراب بُری چیز ہے، تو ہر سننے والا اس کا مقصد یہی سمجھتا ہے، اور یہی اس سے توقع رکھتا ہے کہ وہ شراب سے اجتناب کرے گا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس اقرار کے بعد اُسے شراب پیتے دیکھ لے تو فوراً یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ اپنے اقرار سے پھر گیا۔ یہی معاملہ اللہ کے دین کا بھی ہے۔ اللہ اور رسول نے لوگوں سے بعض حقیقتیں منوانے کی جو کوشش کی ہے اس سے مقصود صرف یہی نہیں ہے کہ وہ بس انہیں مان لیں، بلکہ لازماً یہ بھی مقصود ہے کہ اُن کے اخلاق میں، اُن کے اعمال میں، اُن کے برتاؤ میں، اور اُن کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہ آثار و نتائج ظاہر ہوں جو اس مان لینے کے لازمی آثار و نتائج ہیں۔ اللہ نے اپنے کلام پاک میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمودات میں صاف صاف اُن آثار و نتائج کو بیان بھی کر دیا ہے جو دعوتِ ایمان سے مطلوب و مقصود ہیں اور لازمۂ ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر انہوں نے صرف ان آثارِ مطلوبہ کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ بعض آثار کے متعلق بالفاظ صریح یہ فرما دیا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی میں وہ ظاہر نہ ہوں، یا ان کے برعکس آثار ظاہر ہوں وہ مومن نہیں ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں اس کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں جن سے کوئی صاحبِ علم آدمی ناواقف نہیں ہے اور اُن پر نگاہ ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل کے درمیان ایک ایسا تعلق ہے جو منفک نہیں ہو سکتا۔ چاہے اس کی یہ تعبیر لفظاً صحیح نہ ہو کہ "عمل جزوِ ایمان ہے"، مگر بہر حال عمل لازمۂ ایمان تو ضرور ہے۔

بلا شبہ محتاط فقہاء نے مجرّد ترکِ عمل پر، جبکہ اس کے ساتھ کوئی صریح علامتِ کفر موجود نہ ہو، تکفیر سے احتراز کیا ہے۔ مگر اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ کسی مدعی اسلام کا بے عمل ہونا (یعنی اس کا عملاً غیر مسلمانہ زندگی بسر کرنا) جس طرح اس بات کا احتمال رکھتا ہے کہ اس کا دل ایمان سے خالی ہو اُسی طرح اِس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ وہ غفلت میں مبتلا ہو یا اس کی سیرت میں ضعف ہو۔ ان دونوں احتمالات میں سے کسی ایک کو متعین کرنا ظاہر بین انسانوں کے لیے ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کا کوئی صریح ثبوت نہ مل جائے۔ لہٰذا مجرّد بے عملی کی بنا پر تکفیر کر بیٹھنا خلافِ احتیاط ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ، جو علیم بذات الصدور ہے، اس بات کو جانتا ہے کہ کس شخص کی بے عملی عدمِ ایمان کی بنا پر ہے، اور کس کی

بے عملی ضعفِ اخلاق یا غفلت کی بنا پر۔ جس شخص کی بے عملی درحقیقت ایمان کے فقدان پر مبنی ہو گی وہ بہر حال خدا کے ہاں تو کافر ہی اٹھے گا، خواہ دنیا کے مفتیوں نے اس کی تکفیر نہ کی ہو۔

یہ ہے اس معاملے کی اصل حقیقت۔ جن لوگوں نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا ہے وہ عجیب قسم کی افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے بعض تو بے عمل مسلمانوں کو کھلم کھلا کافر کہہ دیتے ہیں، حالانکہ بے عملی کے دوسرے اسباب بھی ہونے کا قوی احتمال ہے۔ اور بعض حضرات تمام بے عمل مسلمانوں کو ایمان ہی کا نہیں بلکہ جنت کا مژدہ بھی دے رہے ہیں اور ذرا نہیں ڈرتے کہ اس طرح خدا کی نافرمانی پر لوگوں کی ہمت افزائی کرنا بجائے خود ایک سخت جرم ہے جس کی جواب دہی انہیں خدا کے ہاں کرنی ہو گی۔

حدیث کے بعض احکام کو خلافِ قرآن سمجھنے کی غلطی

سوال۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم نماز کی تیاری کریں تو ہمیں وضو کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے از سرِ نو وضو کرنا ضروری ہے، نماز پڑھ لینے کے بعد وضو کی میعاد ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نماز کے لیے بہر حال الگ وضو کرنا لازمی ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ لوگ ایک وضو سے کئی کئی نمازیں کیوں پڑھتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں وضو کے جو ارکان بیان ہوئے ہیں اُن میں کلی کرنے اور ناک میں پانی لینے کا ذکر نہیں ہے اور نہ کہیں ایسے افعال و عوارض کی فہرست دی گئی ہے جن سے وضو ٹوٹتا ہے۔ اس صورت میں کلی وغیرہ کرنا اور بعض امور کو نواقضِ وضو قرار دینا کیا قرآنی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے؟

صلوٰۃِ قصر کے بارے میں بھی قرآن وضاحت کرتا ہے کہ صرف پُرخطر سفرِ جہاد میں ہی نماز میں قصر کیا جا سکتا ہے۔ کیا عام پُرامن سفر میں قصر خلافِ قرآن نہیں ہے؟

جواب:۔ بلاشبہ وضو کے بارے میں قرآن مجید میں یہی حکم ہے کہ جب نماز کے لیے اُٹھو تو وضو کرو۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے کہ اس حکم کا منشا کیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں صرف منہ دھونے

کا حکم ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منہ دھونے کا صحیح طریقہ اور معنی بتلائے کہ اس میں کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا بھی شامل ہے۔ قرآن میں صرف سر کے مسح کا حکم ہے مگر حضور نے ہمیں بتایا کہ سر کے مسح میں کان کا مسح بھی شامل ہے۔ آپ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ وضو شروع کرتے وقت پہلے اُن ہاتھوں کو پاک کر لو جن سے تمہیں وضو کرنا ہے۔ یہ باتیں قرآن میں نہیں بتائی گئی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم قرآنی کی تشریح کر کے ہمیں یہ باتیں بتائی ہیں۔ قرآن کے ساتھ نبیؐ کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ کتاب کے منشاء کو کھول کر ہمیں بتائے اور اُس پر عمل کر کے بتائے۔ آیت وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اے نبی! ہم نے یہ ذکر لوگوں کے پاس براہِ راست بھیج دینے کے بجائے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ اُس ہدایت کی تشریح کرو جو اُن کی طرف بھیجی گئی ہے۔

اس بات کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں تو آپ کو اپنے اِس سوال کا جواب سمجھنے میں بھی کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ ایک ہی وضو سے ایک سے زائد نمازیں پڑھنا کیوں جائز ہے۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ ایک وضو کی مدتِ قیام کس قدر ہے اور کن چیزوں سے یہ مدت ختم ہوتی ہے۔ اگر حضور یہ نہ بتاتے تو ایک شخص یہ غلطی کر سکتا تھا کہ تازہ وضو کے بعد پیشاب کر لینا یا کسی دوسرے ناقضِ وضو فعل کا صدور اُس سے ہو جاتا اور وہ پھر بھی نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ یا مثلاً دورانِ نماز میں ریح خارج ہو جانے کے باوجود نماز پڑھ ڈالتا۔ قرآن میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ نماز کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے، یہ نہیں بتایا گیا کہ وضو کب تک باقی رہتا ہے اور کن چیزوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص بطورِ خود یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ابھی ابھی جس شخص نے وضو کیا ہے، ریح خارج ہونے سے اُس کے وضو میں کیا قباحت واقع ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ حضور نے واضح طور پر یہ بتا دیا کہ وضو کو ساقط کرنے والے اسباب کیا ہیں تو اس سے خود بخود یہ بات نکل آئی کہ جب تک ان اسباب میں سے کوئی سبب رونما نہ ہو، وضو باقی رہے گا خواہ اس پر کتنے ہی گھنٹے گزر جائیں۔ اور جب ان میں سے کوئی سبب رونما ہو جائے تو وضو باقی نہ رہے گا خواہ آدمی نے ابھی ابھی تازہ وضو کیا ہو اور اُس کے اعضاء بھی پوری طرح خشک نہ ہوئے ہوں۔

اگر ہم آپ کے اِس استدلال کو مان لیں کہ قرآن میں چونکہ حکم ہے کہ جب تم نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو، اس لیے ہر نماز کے لیے تازہ وضو ضروری ہے، تو اسی طرح کا استدلال کر کے ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر مستطیع مسلمان کو ہر سال حج کے موقع پر حج کرنا چاہیے اور اس کے برعکس ایک دوسرا شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک مرتبہ زکوٰۃ دے دینے سے حکمِ زکوٰۃ کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ تشریحِ رسول سے بے نیاز ہو کر ہر شخص قرآن کی ہر آیت کی ایک الگ تاویل و تعبیر کر سکتا ہے اور کسی ایک شخص کی رائے دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں بن سکتی۔ (وضو اور نواقضِ وضو کے بارے میں ایک سوال کا جواب میری مطبوعہ کتاب 'رسائل و مسائل' میں فقہیات کے عنوان کے تحت بھی دیا گیا ہے، آپ اُسے بھی ملاحظہ فرمالیں)

قصر کے متعلق سوال کرنے میں بھی آپ وہی غلطی کر رہے ہیں جو وضو کے معاملے میں آپ نے کی ہے۔ قرآن کے منشاء کی تعیین میں قرآن لانے والے رسول کی توضیح و تشریح کو نظر انداز کرنا ایک بہت بڑی اصولی غلطی ہے جس کی بے شمار قباحتوں میں سے چند کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ قرآن صرف حالتِ خوف میں قصر کی صورت بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس حالت میں صرف ایک رکعت بھی کفایت کر سکتی ہے۔ اِس حکم میں کہیں بھی حالتِ امن کے قصر کی نفی موجود نہیں ہے۔ یہ دوسری قسم کا حکم قصر ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہنچا ہے اور وہ یہ ہے کہ عام سفر میں صبح اور مغرب کی نمازیں پوری پڑھی جائیں اور صرف چار رکعت والی نمازوں کو کم کر کے دو رکعت کر دیا جائے۔ اِس قصر کو جو شخص خلافِ قرآن کہتا ہے وہ دو بڑی غلطیاں کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کسی چیز کے قرآن میں نہ ہونے اور اُس کے خلافِ قرآن ہونے کو ہم معنی سمجھتا ہے حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ نبیؐ کے واسطے کو درمیان سے ہٹا کر براہِ راست قرآن کو لینا چاہتا ہے، حالانکہ خدا نے قرآن نبی کے واسطے سے بھیجا تھا۔ کیا وہ شخص یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا نے یہ واسطہ درمیان میں رکھ کر ایک فضول کام کیا ہے؟ ہم اس واسطے کے بغیر خود ہی قرآن سمجھ سکتے تھے۔

دُعا میں بزرگوں کی حُرمت و جاہ سے توسّل

سوال:- مَیں نے ایک مرتبہ دریافت کیا تھا کہ بجاہ فلاں یا بحرمت فلاں کہہ کر خدا سے دعا کرنے

کا کوئی شرعی ثبوت ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا تھا کہ اگرچہ اہل تصوف کے ہاں یہ ایک عام معمول ہے لیکن قرآن و حدیث میں اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکی۔ میں اس سلسلے میں ایک آیت قرآنی اور ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔ سورۂ بقرہ میں اہل کتاب کے بارے میں آیا ہے وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا یعنی بعثت محمدی سے پہلے یہودی کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس کی تفسیر میں امام راغب نے مفردات میں فرمایا ہے ای یستنصرون اللہ ببعثۃ محمدؐ (یعنی بعثت محمدی کے ذریعہ اللہ سے مدد مانگتے تھے) وقیل کانوا یقولون انا لننتصر بمحمد علیہ السلام علی عبدۃ الاوثان (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہودی یوں کہتے تھے کہ ہم کو بت پرستوں کے مقابلے میں محمد علیہ السلام کے ذریعہ سے نصرت بخشی جائے گی) وقیل یطلبون من اللہ بذکرہ الظفر (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے ذکر کے ذریعہ اللہ سے فتح مانگتے تھے)

ترمذی شریف کے ابواب الدعوات میں ایک حسن صحیح غریب حدیث مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ میری تکلیف کو دور کر دے۔ آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں دعا کروں اور اگر صبر کر سکتے ہو تو صبر کرو۔ صبر تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا آپ دعا فرمائیں۔ آپ نے اسے اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا اور یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ۔ انی توجہت بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی۔ اللھم فشفعہ فی۔ (خدایا! میں تیرے نبی محمد نبی رحمت کے ذریعہ سے تجھ سے دعا کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں۔ میں نے اپنی اس حاجت کے لیے اسے پروردگار تیری طرف توجہ کی ہے تاکہ تو میری حاجت پوری کرے۔ پس اے اللہ میرے حق میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت قبول فرما)۔ کیا اس آیت اور اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ دعا میں بحرمت سید المرسلینؐ یا بجاہ نبیؐ یا بطفیل نبیؐ یا ببرکت حضورؐ کہنا صحیح اور جائز ہے؟

جواب۔ آیت مذکورہ کا یہ مطلب میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل آپ کے توسل سے کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب وہ ہے

جو امام راغبؒ کے پہلے دو اقوال سے بھی نکلتا ہے اور جس کی تائید معتبر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے یہودی اُن پیشینگوئیوں کی بنا پر جو آپؐ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں، یہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ نبی آئے اور پھر اُس کی بدولت ہمیں کفار پر غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ ابن ہشام کی روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر جب پہلی مرتبہ مدینہ کے چند لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی اور آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ آپس میں کہنے لگے یَا قَوْمِ تَعْلَمُوا وَاللّٰہِ اِنَّہٗ لَلنَّبِیُّ الَّذِیْ تَوَعَّدُکُمْ بِهِ الْیَہُوْدُ فلا تَسْبِقَنَّکُمْ اِلَیْہِ (ج ۲ ص۔) "لوگو! جان لو کہ خدا یہ وہی نبی ہے جس کی آمد کا خوف تم کو یہودی دلایا کرتے تھے۔ پس ایسا نہ ہونے پائے کہ تم سے پہلے وہ اس کے پاس پہنچ جائیں" پھر آگے چل کر ابن ہشام اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے انصارِ مدینہ کے بڑے بوڑھوں کا یہ قول نقل کرتے ہیں "فینا واللہ وفیھم نزلت ھذہ القصۃ۔ کنا قد علوناھم ظھرًا فی الجاھلیۃ ونحن اھل الشرک وھم اھل کتاب۔ فکانوا یقولون لنا ان نبیًا یبعث الآن نتبعہ قد اظل زمانہ۔ نقتلکم معہ قتل عاد وارم۔ فلما بعث اللہ رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم من قریش فاتبعناہ وکفروا بہ" یعنی یہ آیت ہمارے اور یہودیوں کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ جاہلیت میں ہم ان پر غالب ہو گئے تھے اور ہم اہل شرک تھے۔ پس وہ ہم سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کی آمد کا وقت آپہنچا ہے۔ ہم اس کی قیادت میں تم کو اس طرح ماریں گے جیسے عاد و ارم مارے گئے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش سے مبعوث کیا تو ہم نے آپ کی پیروی اختیار کر لی اور انہوں نے آپ کا انکار کر دیا۔"

رہی جامع ترمذی کی وہ حدیث جو آپ نے نقل فرمائی ہے تو اس کا مضمون تو آپ ہی بتا رہا ہے کہ استدعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی تھی کہ آپ دعا فرمائیں اور آپ نے ہدایت فرمائی کہ اچھا تو اللہ سے دعا کر کہ "خدایا میں تیرے نبی کے واسطے سے تیرے حضور اپنی حاجت لے کر آیا ہوں۔ تو میرے حق میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش قبول کر۔" اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کے حق میں دعا فرمائی اور اس سے بھی فرمایا کہ میرے واسطے سے تو بھی اپنی حاجت طلب کر اور میری سفارش قبول کیے جانے کی بھی دعا مانگ۔ یہ تو دعا کی بالکل ایک فطری صورت ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے

(باقی ص ۳۶۰ پر)

لوگ ہونگے جو "ملا" نہ ہونے پر فخر کرتے ہیں، اور وہ یقین رکھیں کہ رائے عام اور دلیل کی متفقہ طاقت ان کو آخرکار نیچا دکھا کر رہے گی

اس میں شک نہیں کہ اس مطالبے کو منوانے کے لیے عوام جس طریقے سے مظاہرے کر رہے ہیں وہ شائستہ نہیں ہے، اور ملک کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگ کسی طرح اس کو پسند نہیں کر سکتے۔ مگر اپنی قوم کے عوام کو یہ تربیت دینے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ابھی چند ہی سال پہلے اسی پنجاب میں ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ کی وزارت کو توڑنے کے لیے مسلم لیگ نے جو ایجی ٹیشن کیا تھا وہ اس تازہ ایجی ٹیشن سے اپنی کونسی خصوصیات میں کچھ گھٹ کر تھا؟ یہ تو موجودہ قائدینِ ملت کا اپنا لگایا ہوا باغ ہے جس کی بہار دیکھ کر وہ آج گھبرا اٹھے ہیں۔ اب اس مظاہرۂ ناشائستگی کا الزام "ملا" کو دیا جا رہا ہے۔ مگر ہمیں بتایا جائے کہ خضر حیات خاں کے خلاف جس ناشائستگی کے مظاہرے ہوئے تھے وہ کس ملا نے کرائے تھے؟ اینٹی ملا حضرات کا تو اب یہ منہ نہیں ہے کہ شائستگی و ناشائستگی کا سوال چھیڑیں۔ انہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ مطالبہ معقول ہے یا نہیں، اور اس کی پشت پر رائے عام کی طاقت ہے یا نہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں ثابت ہیں تو پھر جمہوری نظام میں کسی منطق سے ان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

بقیہ رسائل و مسائل

کوئی شخص مجھ سے کہے کہ فلاں حاکم کے پاس چل کر میری سفارش کرو اور میں سفارش کرنے کے ساتھ ساتھ اس شخص سے بھی کہوں کہ تو خود بھی حاکم سے عرض کر کہ میں انہیں سفارشی بنا کر لایا ہوں، آپ ان کی سفارش قبول کر کے میری حاجت پوری کر دیں۔ یہ معاملہ اور ہے۔ اس کے برعکس یہ ایک بالکل دوسرا طریقِ معاملہ ہے کہ کوئی شخص مجھ سے اجازت لیے بغیر خود ہی حاکم کے پاس پہنچ جائے اور اپنی جو حاجت بھی چاہے میرا واسطہ دے کر پیش کر دے۔ اس دوسری صورت کو آخر پہلی صورت پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ دلیل پہلی صورت کی پیش کرنا اور اس سے جواز دوسری صورت کا نکالنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ دوسری صورت کا جواز ثابت کرنے کے لیے تو حضورؐ کا کوئی ایسا قول ملنا چاہیے جس میں آپ نے اپنے تمام نام لیواؤں کو عام اجازت مرحمت فرمائی ہو کہ جس کا جی چاہے، اپنی ہر حاجت میرا واسطہ دے کر اللہ سے طلب کر لے۔